تصوّرات

عَلاّمہ اِقبالؒ بحضورِ آدم — خلقی اور فطری شرف

(۲)

پروفیسر محمّد منوّر

www.IqbalCyberLibrary.net
All rights reserved.
©2002-2006

طلسمِ بُود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے، قادر نہیں ہے جس پہ سخن
زمانہ صبحِ ازل سے رہا ہے محوِ سفر
مگر یہ اس کی تگ و دو سے ہو سکا نہ کہن
اگر نہ ہو تجھے اُلجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انساں، نہ روح ہے، نہ بدن!

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ازروئے قرآن خدا نے آدم کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا۔ 'ونفخ روح' بھی ذہن میں ہے، پیمانِ الست بھی۔ یہ بھی کہ خدائے خلاق نے ہر وجودِ آدم میں اپنی جانب کشش کا جوہر ودیعت کر دیا۔ تو آیا پھر آدمی ایک مجبورِ محض مخلوق تھا، ملائکہ کی طرح کہ بس حکم مانے اور تعمیل کرے، اور اس کے سوا کچھ کر ہی نہ سکے؟ اگر ایسا ہوتا تو پھر یقیناً فرشتوں کا وجود کافی تھا۔ اور یہی فرشتوں نے بحضورِ خدا التجا بھی کی تھی کہ ہم ہر دم تسبیح، تقدیس اور تجلیل کے لیے موجود ہیں ——— خدائے تعالیٰ 'یفعل ما یرید' ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ آیا آدم کو بھی 'مایرید' کا کوئی پرتو نصیب ہوا؟ ——— یقیناً ہوا، اور یہ من مانی کر گزرنے کی اہلیت اللہ نے آدم کو خصوصی شان اور امتیازی آن کے طور پر بخشی۔ اور اسی میں اس کا سب سے بڑا امتحان بھی پوشیدہ تھا۔ یہاں ذہن اس آیۂ کریمہ کی طرف لوٹ جاتا ہے:

انا عرضنا الامانة علی السموات والارض والجبال
فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسٰن
انہ کان ظلوما جھولا ———

"ہم نے (یہ) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے رکھی تو ان سب نے انکار کیا، اس سے کہ اسے اٹھائیں۔ اور وہ اس سے ڈرے۔ مگر آدمی نے اسے اٹھا لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم ہے، بڑا جاہل ہے!"

مولانا عبدالماجد دریا بادی اس آیۂ کریمہ کی تفسیر میں، ابنِ کثیر کے حوالے سے، حضرت حسن بصری کا قول نقل کرتے ہیں:

ساتوں آسمانوں اور زمین سے خطاب ہوا کہ تم یہ امانت اور جو کچھ
اس میں ہے، اٹھاؤ گے؟
عرض کیا، اس میں کیا ہے؟
ارشاد ہوا، نیکی پر اجر و ثواب اور بدی پر مواخذہ و عذاب۔
اس پر سب نے عذر کر دیا۔ پھر اسی طرح زمین سے، پھر پہاڑوں سے
خطاب ہوا۔[۲]

مراد یہ کہ اختیار دے دیا جائے گا، اس شرط پر کہ ہر فعلِ خیر کے باب میں ثواب عطا ہوگا اور ہر فعلِ شر کے ضمن میں مواخذہ و عذاب عمل میں آئے گا۔ ظاہر ہے کہ مجازاً زمینوں، آسمانوں، پہاڑوں اور کوہستانوں کا ذکر کیا گیا۔ بلندیوں پر بسنے والوں اور پستیوں پر آباد بڑے سے بڑے باشوکت وجودوں کو مسئولیت اور ذمہ داری کی شرط کے ساتھ اختیار قبول کرنے کا یارا نہ تھا۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ کائنات میں آدم کے سوا کسی وجود میں وہ جوہر ودیعت نہیں کیا گیا جسے اختیار کہتے ہیں۔ اس الوہی شان کا پرتو اُسی وجود کو عطا ہو سکتا تھا جس میں اس کے تحمل کی ہمت از روئے فطرت رکھی گئی ہے۔

علامہ راغب اصفہانی کہتے ہیں:

"امانت سے مراد کلمۂ توحید ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد عدالت ہے
یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد حروفِ تہجی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد عقل ہے۔
اور یہی بات صحیح بھی ہے، اس لیے کہ حصولِ عقل ہی سے معرفتِ توحید
حاصل ہوتی ہے۔ عدالت بھی عقل ہی کی بدولت عمل میں آتی ہے اور حروف
کا علم بھی عقل ہی کے باعث میسر آتا ہے، بلکہ عقل ہی کے حصول کی خاطر
اس سب کچھ کا علم حاصل کیا جاتا ہے جس کا حصول آدمی کے بس میں ہے
اور اسی کی وجہ سے آدمی کو کارِ خیر پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی
سبب سے آدمی کو کثیر مخلوق پر فضیلت دی گئی۔"[۳]

اور ظاہر ہے کہ عقل ہی کی بدولت فعلِ خیر و شر میں امتیاز روا رکھنے کی ذمہ داری بھی آن پڑتی ہے، حصولِ علم اور پھر حسبِ مقدور علم مسئولیت۔ حلال و حرام، مستحب اور منکر کے مابین تفریق کرنے کی اہمیت ـــــ وہ جوہر جو کسی دوسری مخلوق کو اس طرح میسر نہیں جس طرح انسان کو میسر ہے۔ میزان، عقل کے پاس ہے۔ مگر بات عقل کی تمیزی قابلیت پر ختم نہیں ہو جاتی۔ تمیزِ خیر و شر کے بعد فیصلہ کن قوت عقل نہیں۔ عقلی دلیل کافی نہیں، فیصلہ کن عنصر آدمی کا 'منہ زور'

جبلّی تقاضا ہے یا اٹل ارادہ ۔ آدمی اس پر قادر ہے کہ جبلّت کے وحشی اور بے لگام گھوڑے کو عقل کی راستے اور عزم و ارادہ کی قوّت سے قابو میں لائے اور قابو میں رکھے ۔ اور یہ بھی ممکن ہے وہ آدمی ساری دانش و بصیرت کے باوصف سرکش جبلّت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے اور عقل فریاد کرتی رہ جائے ۔ آدمی کارِ خیر کی جملہ قابلیتوں کے باوصف شر کا ارتکاب بھی کرتا ہے ، اس لیے کہ اس میں یہ اہلیت و دیعت شدہ ہے ۔ وہ شر کی جملہ کرشمہ سامانیوں کے باوجود اس سے کنارہ کشی بھی اختیار کر لیتا ہے ، اس لیے کہ اس میں یہ صلاحیت بھی فطری جوہر کی طرح موجود ہے ۔ لہٰذا آدمی سے نیکی بھی عمل میں آسکتی ہے اور وہ بدی کا ارتکاب بھی کر سکتا ہے ۔ اس کے مقابل حیوان ارتکابِ جرم و گناہ کر ہی نہیں سکتا ۔ اسے جو کچھ کرنا ہے فقط جبلّتوں کے بل بوتے پر کرنا ہے لہٰذا وہ مسئولیت کے زیرِ بار نہیں ۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

"امام غزالی اور بیضاوی نے تنبیہ کی ہے کہ امانت مکلّف ہونے کی ذمّہ داری ہے ، اس طرح پر کہ اطاعت اور نافرمانی احکام سے ثواب یا عذاب کا استحقاق ہو سکے ۔" [۴]

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے یہ بھی فرمایا کہ :

"مکلّف ہونے کے قابل وہی چیز ہو سکتی ہے جس کا کمال بالقوّہ ہو ، نہ بالفعل ۔" [۵]

عباس محمود العقاد کہتے ہیں :

"وبهذه الامانة ارتفع الانسان مكانا عليا فوق مكان الملئكة لانه قادر على الخير و شره فله فضل على من يصنع الخير لانه لا يقدر على غيره ولا يعرف سواه ۔" [۶]

"اسی امانت کی بدولت آدمی بلندی پر پہنچا اور فرشتوں سے بھی بلند تر مقام کو جا لیا ، اس لیے کہ وہ خیر پر بھی قادر ہے اور شر پر بھی ؛ لہٰذا اسے فضیلت ہے اس پر جو فقط کارِ خیر کرے ، اس لیے کہ خیر کے سوا کسی امر پر قادر ہی نہ ہو بلکہ خیر کے سوا کچھ جانتا ہی نہ ہو ۔"

غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ خلّاق العالمین نے بنو آدم کو یہ اختیار دے کر گویا بہت بڑا خطرہ خریدا ، ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ خلّاق العلیم نے بنو آدم پر بہت بڑا بھروسا کیا ۔ خیر تو وہی

ہے جو بالارادہ اور سوچی سمجھی خیر ہو، جبری یا فقط جبلّی خیر صحیح معنوں میں، عملِ خیر قرار نہیں پا سکتی حضرت علامہ فرماتے ہیں:

"دراصل خیر میں جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خیر کا مطلب ہے انسان کا برضا و رغبت کسی اخلاقی نصب العین کی پیروی کرنا، جس کا دار و مدار پھر اس بات پر ہے کہ وہ "انا" جن کو اختیارِ ذات کی نعمت حاصل ہے برضا و رغبت ایک دوسرے سے تعاون کریں، اس لیے کہ وہ ہستی جس کے اعمال و افعال کل کی طرح متعین ہیں، خیر کی اہل کیسے ہو سکتی ہے۔ آزادی خیر کی شرطِ اولین ہے، یہ دوسری بات ہے کہ ایسے نفوس متناہیہ کی آفرینش جن کے سامنے عمل کا ایک نہیں، کئی راستے ہوں اور ہر راستے کی اپنی اپنی قدر و قیمت، ایک بہت بڑا خطرہ ہے، کیونکہ ہم ان میں سے جس راستے کو چاہیں اختیار کر سکتے ہیں، لیکن اگر انسان خیر کا انتخاب کر سکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس کی ضد یعنی شر کا انتخاب کرے۔ لہٰذا اگر مشیتِ ایزدی یوں ہی تھی کہ اس طرح کا خطرہ برداشت کر لیا جاتے تو اس سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ خدا کو اپنے بندوں پر کس قدر اعتماد ہے۔ اندریں صورت انسان کا بھی فرض ہے کہ اس اعتماد میں پورا اترے۔" [۷۹]

بہر حال، افراد بقدرِ وسعت اپنے اعمال و کردار کے ذمہ دار ہیں۔ وہ پہلو جو نفخِ روح والا، فطرۃ اللہ اور علم الاسماء، نیز امانت والا پہلو ہے، وہ مادی پہلو سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ مگر یہ مرحلہ بھی اس وقت آتا ہے جب آدمی کسی قدر خود آگاہ ہو کر خیر و شر میں فرق کو جاننے لگتا ہے، پھر نتیجہ یہ کہ کبھی وہ بلندی کی طرف جاتا ہے، کبھی وہ پستی کی طرف لڑھکتا ہے۔ وہ اہلِ ہمت کم، بلکہ بہت ہی کم ہوتے ہیں جو اپنے پوشیدہ جوہرِ اختیار کو اس طرح بروئے کار لاتیں کہ اپنی شخصیت کے روشن پہلو کو تاریک پہلو پر فیصلہ کن انداز میں حاوی کیے رکھیں۔

عباس محمود العقاد کی رائے میں:

"انما احجیٰ ان یقال ان الانسان قنطرۃ من الارض الی السماء یعبدھا اللہ —— قنطرۃ قرارھا اسفل سافلین و ذروتھا اعلیٰ علیین۔" [۸۰]

"مناسب تر ہو گا یہ کہنا کہ انسان اللہ تک پہنچانے والا پل ہے جو زمین سے آسمان تک چلا گیا ہے۔ اس پل کو اللہ تعالیٰ نے تعمیر کیا ہے۔ اس پل کا پایہ اسفل سافلین ہے اور چوٹی اعلیٰ علیین ـــــ"

درحقیقت عباس محمود العقاد نطشے کے اس قول پر رائے زنی کر رہے تھے کہ

"آدمی بندر اور خدا کے مابین پل کا کام دیتا ہے"[9]

ڈاکٹر یوسف حسین خان نے عبدالکریم الجیلی کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ

"انسان بجائے خود ایک عالم ہے جو خدا اور فطرت، دونوں کا مظہر ہے۔ انسانی ہستی ذاتِ باری کی خارجی شکل ہے۔ بغیر انسانی وجود کے ذاتِ مطلق اور کائناتِ فطرت میں رابطہ نہیں قائم ہو سکتا۔ انسان ان دونوں وحدتوں میں اتصالی کڑی کا حکم رکھتا ہے"[10]

پہلے مقالے کا آغاز ہی "احسنِ تقویم" کے حوالے سے ہوا تھا۔ حدِ مقابل ہے "اسفل سافلین" ـــ عباس محمود العقاد نے یہی بات تو کہی ہے۔ آدم کو ایک ایسے پل سے تشبیہہ دے کر جس کا پایہ پاتال ہو اور چوٹی عرشِ معلیٰ ـــــ اگر آدمی نوری پہلو کی تربیت کرتا چلا جائے تو بلند تر ہوتا چلا جائے، اور اگر خاکی پہلو سے چپک کر رہ جائے تو گرتا چلا جائے۔ بے لگام جبلتوں کا بے بس رہین و اسیر ـــــ مگر جان اور جسم ایک دوسرے امتحان ہیں اور دونوں میں حسین ربط ایک خوبصورت وحدت ہے، اور تصادم وحدت شکن۔ حضرت علامہ اس باب میں لکھتے ہیں:

"لہٰذا انسان عبارت ہے جس وحدت سے، جب اس کے اعمال و افعال کا مشاہدہ عالمِ خارجی کے حوالے سے کیا جاتے تو ہم اسے بدن لیکن جب ان کی حقیقی غرض و غایت اور نصب العین پر نظر رکھی گئی تو روح کہیں گے۔ گویا بہ حیثیت ایک اصولِ عمل، توحید اساس ہے، حریت، مساوات اور حفظِ نوعِ انسانی کی"[11]

آدمی کے اس اختیار، بدن و روح کی ہمسائیگی اور اس کے اثرات و عواقب کا ذکر چل نکلے تو بات جنت سے ہبوطِ آدم تک پہنچتی ہے۔ خبر یہ ہے کہ آدم کی جنت یعنی کسی باغِ نداوندی میں رہائش تھی اور اسے ہر طرح کے پھل اور میوے کھانے کی اجازت تھی۔ البتہ اسے ایک پودے کے قریب بھٹکنے سے منع کر دیا گیا۔

"ولا تقربا هٰذه الشجرة فتكونا من الظالمين"[12]

"مگر اس پودے کے قریب نہ جانا، اگر ایسا کرو گے تو اپنی حد سے گذر جانے والوں میں شمار ہو گے۔"

"فوسوس لهما الشیطٰن لیبدی لهما ما وٗری عنهما من سوآتهما"[۲۲]

گویا آدم اور حوا، شیطان کے بہکانے میں آ گئے اور وہ کچھ کر گزرے جس سے منع کیا گیا تھا ــــــ وہ شجرِ ممنوعہ کیا تھا، اس ضمن میں اہلِ رائے نے مختلف آرا پیش کی ہیں۔ لیکن چونکہ خود اللہ میاں نے رمز سے کام لیا ہے اور بالوضاحت کچھ نہیں بتایا، لہٰذا بقول حافظ ؒ

چوں ندید ند حقیقت رہِ افسانہ زدند

اس مورد میں حضرت علامہ کی بھی رائے ہے، اور وہ یہ ہے:

"شیطان نے اسے ورغلایا کہ علمِ خفی کے شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھے، اور آدم اس کے ورغلانے میں آ گیا۔ اس لیے نہیں کہ شر اس کی سرشت میں داخل ہے بلکہ اس لیے کہ وہ فطرتاً 'عجول' ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ علم کی منزلیں عجلت سے طے کرے، لہٰذا اس کا یہی رجحان ہے جس کو صحیح راستے پر ڈالنے کی ایک ہی صورت تھی، اور وہ یہ کہ اس کی پرورش کسی ایسے ماحول میں ہو جہاں دکھ درد کی تکلیف کے باوجود اسے ذہنی قوتوں کے اظہار کا موقع ملتا رہے۔"[۲۴]

اس امر کی مزید وضاحت علامہ کے کلمات ذیل میں ملتی ہے:

"ــــــ لہٰذا قرآن مجید نے ہبوطِ آدم کا ذکر کیا تو یہ بیان کرنے کے لیے نہیں کہ کرۂ ارض میں انسان کا ظہور کس طرح ہوا، اس کے پیش نظر حیاتِ انسانی کا وہ ابتدائی دور ہے جب اس پر جبلی خواہشات کا غلبہ تھا اور جس سے گزر کر اس نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ وہ اپنی ذات میں آزاد اور اس لیے شک اور نافرمانی، دونوں کا اہل ہے، مختصراً یہ کہ ہبوط کا اشارہ کسی اخلاقی پستی کی طرف نہیں، اس کا اشارہ اس تغیر کی طرف ہے جو شعور کی صاف و سادہ حالت میں شعورِ ذات کی اولیں جھلک سے اس نے اپنے اندر محسوس کیا۔ وہ خوابِ فطرت سے بیدار ہوا اور سمجھا کہ اس کی حیثیت خود بھی اپنی جگہ پر ایک سبب کی ہے۔ یوں بھی قرآن مجید

میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ کرہ ارض ایک دار العذاب ہے جہاں انسان، جس کا خمیر ہی بدی سے اٹھایا گیا ہے، کسی اوّلیں گناہ کی پاداش میں قید و بند کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ برعکس اس کے، اس کی پہلی نافرمانی وہ پہلا اختیاری عمل تھا جو اس نے اپنے ارادے اور مرضی سے کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ارشادِ قرآنی کے مطابق آدم کا یہ گناہ معاف کر دیا گیا۔[۱۵]

آدم نہ فرشتہ تھا نہ حیوان کہ جبلّت کے دائرے سے باہر از روئے فطرت قدم نہ رکھتا۔ آدم کی فطرت جسے خود خدا نے اپنی فطرت کا پرتو قرار دیا، خود آگاہ ہونے کے بعد من مانی کرنے سے باز نہ رہ سکا؛ چنانچہ شجرِ ممنوعہ سے بے تکلفی کر گزرا، شجرِ ممنوعہ جو کچھ بھی تھا۔ لہٰذا یاد دہانی کی گئی کہ تمہیں اس بات سے منع کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی بتا دیا گیا کہ اب خود آگاہ ہو جانے کے بعد تمہارا آئندہ میدانِ عمل یہ جگہ نہیں رہنی چاہیے، اب اپنی مرضی کی پرورش کے لیے ایسے ماحول میں جاؤ جہاں اپنی فطرت کے آزاد پہلو کو اجاگر کر سکو۔ ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ آدم و حوّا جنت میں کتنا عرصہ آباد رہے، عالم کے تکوینی امور کے ضمن میں ہمارے کیلنڈر کام نہیں دیتے، لہٰذا ظنّ و تخمین سے بات نہیں بنتی۔

بہرحال، آدم کو ایک نئے ماحول کے سپرد کر دیا گیا۔ آدم کو پرانا ماحول چھوڑتے وقت یقیناً افسوس ہوا ہوگا اور اس کی یاد ایک خلش بن کر ستاتی رہی ہوگی۔ یہی نہیں، یہ حسرت، آئندہ نسلوں میں بھی لازماً منتقل ہوتی ہوگی۔ حضرت علامہ کے بقول ؎

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے[۱۶]

گو مشیّتِ ایزدی کا تقاضا یہی تھا کہ آدم اپنے امکاناتِ ذات کو بروئے کار لانے کے لیے محنت و مشقت کے طلبگار ماحول میں رہے، مگر آدم و حوّا کو نافرمانی کا شعور یقیناً پریشان بلکہ پشیمان کرتا رہا۔ قرآن اس امر پر گواہ ہے کہ آدم و حوّا نے التجا کی:

رَبَّنَا ظَلَمۡنَآ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ[۱۷]

"اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر بے حد زیادتی کی۔ اگر تو مغفرت سے نہیں نوازے گا اور رحم نہیں کرے گا تو پھر ہمارا شمار اہلِ خسارت میں ہو کر رہے گا۔"

ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر کی طرف سفر اختیار کرتے وقت گھبراہٹ، جھنجلاہٹ اور خوف وغیرہ

عناصر کا طبیعت پر حاوی ہونا قدرتی اور فطری امر تھا۔ تاہم آدم کو، جسے

"انی جاعلٌ فی الارض خلیفة"

کا مشارٌ الیہ بنایا گیا تھا، زمین ہی کے لیے تیار کرنا مقصود تھا۔ آخر اسے زمین سے کب تک دور رکھا جا سکتا تھا۔ خدائے تعالیٰ نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں جنت میں کوئی خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں لہٰذا جب امیرِ فطرت، تسخیرِ فطرت کے لیے تیار ہو گیا تو حکم ملا اب چلو اور اپنا فرضِ منصبی سنبھالو۔

صاف دکھائی دے رہا ہے کہ حضرت علامہ، آدم کی نافرمانی کو بطور معصیت یا بغاوت اتنی اہمیت نہیں دے رہے جتنی خوشی انہیں اس نافرمانی کے جلو میں "اظہارِ خودی" کے احساس سے ہے۔ آخر آدمی نے من مانی کر گزرنے کا آغاز تو کیا! حضرت علامہ کے دل میں آدم کے اس آغازِ ارتقا کے باعث مسرت چٹکیاں لیتی ہے جس کا مظہر "بالِ جبریل" کی یہ دو مشہور نظمیں ہیں "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں"۔۔۔۔۔ "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے"۔۔۔۔ پہلی نظم یہ ہے:

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی!
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے، لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی!
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی!
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی![۱۸]

اور "اب روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" کا یہ منظر ملاحظہ ہو:

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ!
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ!
ایامِ جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ!
بے تاب نہ ہو، معرکۂ بیم و رجا دیکھ!

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں!
یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں!
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایّام میں آج اپنی ادا دیکھ!
سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے!
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے!
ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ!
خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنّت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!
نالندہ ترے عُود کا ہر تار ازل سے
تو جنسِ محبّت کا خریدار ازل سے
تو پیشِ صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ![49]

ان نظموں کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہ نے آدم کے جنّت سے نکالے جانے کو وعید نہیں بنایا، اسے باعزّت وداع کی صورت دے دی ہے۔ اور زمین پر ورود کو تو استقبالِ مسعود بنا دیا ہے۔ یہاں بھی وعید کا لہجہ نہیں، عید کا ہے۔ گویا حضرت علامہ، خالقِ کون و مکاں کی تدبیرِ غالب کو روحِ آدم کی پرورش پر مرکوز جانتے ہیں تاکہ خلیفۂ خدا مستخلف منہ کی شان کے شایاں ہو۔ ہبوطِ آدم کے باب میں حضرت علامہ کے موقف کی تائید اور وضاحت کرتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم تحریر فرماتے ہیں:

"یہاں آدم کے ذکر کے بعد ہی پوری نوعِ بشر کو بہ صیغۂ جمع خطاب کیا گیا ہے
اقبال کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ قرآن نے آدم کے متعلق جو کچھ کہا ہے، وہ کسی
ایک فرد کا ذکر نہیں بلکہ نوعِ انسان کی نفسیات اور اس کے ممکنات کا بیان
ہے ——— علامہ اقبال نظریۂ ارتقا کے قائل تھے لیکن یہ نظریہ ڈارونی
نہیں تھا بلکہ عارف رومی اور حکیم برگساں کے نظریات کے مماثل تھا۔ ان کا
خیال تھا کہ نوعِ انسان ایک درجۂ ارتقا میں حیات کی ایک خاص منزل
میں تھی جس کا اس سے نکلنا مزید ترقی کے لیے لازمی تھا ———
اور متقیوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے وہ اس جنت کی
طرف عود نہیں ہے جسے نوعِ انسان بہت پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ آئندہ
زندگی کی پیکار اور تسخیر سے جو جنت حاصل ہوگی، وہ پہلی جنت سے
افضل ہوگی، اور اسی طرح آگے جو جنتیں آئیں گی، ان میں کہیں ایک
حالت پر قیام نہ ہوگا۔ 'تخلقوا باخلاق اللہ' کی سعیِ مسلسل ہر
مرحلے میں جاری رہے گی۔ ہر جنت ایک نئے انداز کا دارالعمل ہوگی۔
عمل اور زندگی ایک ہی چیز ہے۔ ازروئے قرآن بھی تکریمِ آدم پہلی جنت
سے نکلنے کے بعد ہی ظہور میں آئی۔ آدم پہلی جنت سے نکلنے کے بعد
ہی خلیفۃ اللہ فی الارض بنا ——— قرآن نے ہبوطِ آدم کے تصور کو
عروجِ آدم کا نظریہ بنا دیا۔ آدم کے متعلق عیسوی اور اسلامی نظریے
میں یہ ایک بنیادی فرق ہے۔ عیسائیت کے مطابق آدم کی نافرمانی کا گناہ اس
کی فطرت میں پیوست ہوگیا۔ خدا نے اسے معاف نہ کیا بلکہ سزا کے لیے
پہلے دنیا میں بھیج دیا، اور قیامت تک اس کی ذریت ناکردہ گناہ میں
ملوث ہی پیدا ہوتی رہے گی اور ملوث ہی مرتی رہے گی۔ یہ سزا کا لامتناہی سلسلہ حضرت مسیحؑ کے
کفارے پر ختم ہوا جس نے تمام بنی نوع انسان کے گناہ اپنی گردن پر
لیے اور لعنت کی موت قبول کی۔ اب بھی فقط ان انسانوں کی نجات ہو سکتی
ہے جو اس کفارے کے قائل ہوں ورنہ ناکردہ گناہ پیدائشی، آدم کی
عصیانی وراثت کی وجہ سے جاری رہے گی۔ قرآن نے آدم کی ایک سرسری
لغزش کو معاف کر کے اسے انعام و اکرام کا مستحق بنا دیا جس کے بعد

آدم کی اولاد میں سے ہر ایک معصوم پیدا ہوتا ہے اور زندگی اور اس کے بعد اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، کسی ایک فرد کا گناہ دوسرے کے ذمے نہیں لگتا ــــ لاتزر وازرۃ وزر اخریٰ۔"[۲۰]

عباس محمود العقاد بھی ہر مسلمان مفکر کی طرح اسی نظریے کے مالک ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"فالاسلام لا یعرف الخطیئة الموروثة ولا یعرف السقوط من طبیعة الیٰ ما دونها فلا یحاسب احداً بذنب أبیه ولا تزر وازرة وزر أخریٰ"[۲۱]

"پس اسلام موروثی گناہ کا قائل نہیں نہ اس کا قائل ہے کہ آدم کو اس کی فطرت سے کمتر درجے کی فطرت پر اتار دے، اور نہ کسی کا محاسبہ اس کے باپ کے گناہ کے بدلے میں کرتا ہے۔ اور (ظاہر ہے) کوئی جان کسی دوسری جان کا بار (بارِ گناہ) نہیں اٹھاتی۔"

ہبوطِ آدم، از روئے اسلام اولادِ آدم کو کسی موروثی گناہ کا مرتکب نہیں بناتا، اور نہ اولادِ آدم کے گلے میں طوقِ مجرمیت ڈالتا ہے۔ حضرت علامہ نے آدم کی اولیں غفلت جمع نافرمانی کو اس کے حق میں خیر جانا۔ یہی مشیت ایزدی بھی تھی کہ جب آدم کا رِ زمین کی مشقتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائے اور اس میں عناصرِ آفرینش و بقائے عالم پر حکمرانی کا بڑا اعتماد و ذوق نمودار ہو جائے تو اسے وہاں اتار دیا جائے جہاں اس کے فطری جوہر چمکیں ــــــ حضرت علامہ نے اپنی نظم میں جس کا عنوان ہے "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" ــــــ آدم کے بظاہر ہبوط اور بباطن صعود و عروج کا بڑی مسرت کے ساتھ ذکر کیا ہے جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ آدم کو معناً بلندی سے پستی کی طرف نہیں پھینکا گیا بلکہ بلندیوں سے مزید بلندیوں میں لے جا کے اتارا گیا ہے۔

حضرت علامہ نے اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں جانی کہ وہ جنّت جس میں آدم کو ٹھہرایا گیا تھا، اس سے کیا مراد ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ میاں نے آدم کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا تھا نہ کہ جنت میں۔ لہٰذا اسے زمین ہی میں آ کے اپنے ممکناتِ آدمیت کو کمال تک پہنچانا تھا۔ جنّت میں پڑے رہنا اس کے منصب کا مقدر ہی نہ تھا، آیا یہ ممکن ہے کہ وہ جنّت یا باغ اسی زمین کا کوئی حصہ ہو جہاں آدم و حوّا کو بلا مزد و مشقّت معاش میسّر تھی، اور

IqbalCyberLibrary All rights reserved ©2002-2006

پھر جب انہوں نے وہاں پر پُرزے نکالے تو انہیں مفت کی اور سہل زندگی والے ماحول سے نکال کر سخت ماحول میں ڈال دیا گیا۔

جناب شہیر نیازی لکھتے ہیں:

Though after committing a sin and becoming naked, Adam and Eve were pardoned by God the Merciful but now they were advised (not admonished) to leave this beautiful garden situated on some high ridge and to live on the plains so that they may be able to till the earth to feed their progeny. The word which is used for their expulsion is 'ahbatu' اهبطوا. The root of this word is 'habt' هبط, which means 'going down' from a high place to a lower one but it does not mean 'falling from heaven' or anything like that. The Holy Quran is the Word of God and on such occasions it miraculously explains it's complexities itself. In the same Surah this 'ahbatu' اهبطوا is used in a manner which is explanatory enough when God said to the Jews 'Get ye down into Egypt'.[۲۳]

شہیر نیازی صاحب نے کتاب کے عنوانی صفحے کے بائیں حصے میں یہ صراحت درج کی ہے:

This book is the first book in the world wherein the Quranic view about Earthly Paradise where Adam and Eve lived, is proved to be a geographical fact.

جناب شہیر نیازی کی یہ مختصر سی کتاب بڑا دلچسپ مطالعہ ہے۔ انہوں نے درجنوں حوالوں کے ساتھ اپنی بات واضح کی ہے اور بلاشبہ خاصی محنت سے کام لیا ہے۔ بعض جگہ انہوں نے حوالوں کی جانب فقط اشارہ کر دینے پر اکتفا کیا ہے، حوالوں کی عبارات کم کم نقل کی ہیں۔ اگر وہ حوالوں کے بجائے عبارات بھی نقل کر دیتے تو کتاب پوری کتاب بن جاتی اور مزید دلچسپ بھی ہوتی۔ بہرحال، انہوں نے آخری رائے کے طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آدمی کی گم گشتہ جنت اسی ہمارے جہانِ آتش و آب و خاک و باد میں تھی اور اس برِّ عظیم میں واقع تھی جسے افلاطون نے Atlantis کا نام دیا تھا اور جو بحر اوقیانوس میں غرق ہو گیا تھا ——

بہرحال، آدم و حوّا اپنی اولاد کے ہمراہ، جن کی گنتی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، جنت سے

All rights reserved. ©2002-2006

نکال دیے گئے۔ اور جنت سے نکالے جانے کی یہ خلش اولادِ آدم کے ان جملہ گروہوں اور معاشروں کے دلوں میں ہمیشہ، کسی نہ کسی طرح، زندہ رہی جو کسی بھی ایسے مذہب کے پیرو تھے جس کی اساس وحی تھی۔ حضرت علامہ کے کلام میں آدم کی اس ہجرت، جلاوطنی اور غربت کے متعلق کئی اشعار موجود ہیں۔ ان اشعار کا ایک پہلو مضامین حسرت پر مبنی ہے اور دوسرا، جنت سے نکالے جانے کے نتیجے میں، اس جہانِ خاکی کی تعمیر و ترقی کے بارے میں ہے ؎

میرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تاب جاودانہ! [۲۳]

قصور وار، غریب الدیار ہوں، لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد! [۲۴]

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟ [۲۵]

فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا، یہ مقام آسماں سے دور نہیں [۲۶]

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے!
کہ خاکِ زندہ ہے تو، تابعِ ستارہ نہیں [۲۷]

طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم!
خدا کا راز ہے، قادر نہیں ہے جس پہ سخن [۲۸]

فرشتہ را دگر آں فرصتِ سجود کجاست
کہ نوریاں بہ تماشائے خاکیاں مستند [۲۹]

خویش را آدم اگر خاکی شمرد
نورِ یزداں در ضمیرِ او بمرد [۳۰]

مقدر است کہ مسجودِ مہر و مہ باشی
ولے ہنوز ندانی چہا توانی کرد [۳۱]

گفت یزداں کہ چنیں است و دگر ہیچ مگو
گفت آدم کہ چنیں است و چناں می بایست [۳۲]

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. © 2002-2006 اقبال سائبر لائبریری

سابقہ اوراق میں ابلیس کی طرف اشارہ گزر چکا ہے کہ اس نے آدم و حوّا کو ورغلایا، بہکایا اور بالآخر ان کو جنت سے نکلوانے کا باعث بنا ـــــ وہ آیۂ کریمہ پہلے درج کی جا چکی ہے جو فوسوس لھما الشیطان ـــــ سے شروع ہوتی ہے ـــــ

یہ آیۂ کریمہ آدم کے باب میں شیطان کو دوبارہ کارفرما پاتی ہے۔ پہلے وہ اس فرمانِ خدا کے ضمن میں نظر آتا ہے جس میں خدا نے فرشتوں کو آدم کے حضور میں سرِ ادب جھکانے کا حکم دیا تھا اور اس نے انکار کر دیا تھا ـــــ دوسری کارروائی یہ تھی کہ آدم و حوّا اور ان کی اولاد کو راحت و آرام کے اس ماحول سے نکلوایا جس میں انہیں بلا مزد فراواں معاشں میسر تھی۔ حضرت علامہ کی نظروں میں جس طرح آدم کا جنت سے نکالا جانا تقدیرات سے نبرد آزمائی کی راہ کھُلنا قرار دیا اور مشیتِ ایزدی کا عطا کردہ انعام ٹھہرا، اسی طرح حضرت علامہ شیطان کو بھی ایک ناگزیر آدم گرعنصر جانتے ہیں۔ مگر کیا مشیتِ الٰہی وہ رازِ نہاں تھی جسے شیطان جانتا تھا؟ بقول حضرت علامہ ـــــ

اے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر؟
مجھے معلوم کیا! وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟[43]

پھر یہ بھی عیاں ہے کہ ابلیس کی خلقت میں بغاوت اور سرکشی کا جوہر خود خالق نے پیدا کیا تھا۔ بقول حضرت علامہ ـــــ

مرا گوئی کہ از شیطاں حذر کن
بگو با من کہ اُو پروردۂ کیست؟[44]

حضرت علامہ کے نزدیک ابلیس کا وجود آدم کے لیے ایک مستقل امتحان اور دعوتِ مبارزت کی علامت ہے۔ اس مورد میں مجھے ایک واقعہ یاد آیا، اور وہ درج ہو جانا چاہیے۔ یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے کہ کابل یونیورسٹی کے استادِ ادبیات غلام سرور خاں گویا کی علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم کے یہاں دعوتِ عشائیہ تھی۔ مرحوم ڈاکٹر بشیر احمد وائس چانسلر تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر نیاز احمد (کیمیکل ٹیکنالوجی) ڈاکٹر وحید (فیروز سنز لاہور) آقا بیدار بخت، قاضی ظہیر الدین، شیخ امتیاز علی، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اور دیگر کئی علمی اکابر جمع تھے۔ طلبا میں سے میں اور میرے دوست محمد خورشید عالم (جو حال ہی میں کیڈٹ کالج حسن ابدال سے ریٹائر ہوتے ہیں) مدعو تھے وہاں باتوں باتوں میں ڈاکٹر نیاز احمد نے، جو اِن دنوں کیمیکل ٹیکنالوجی کے صدر شعبہ تھے، ذکر فرمایا کہ وہ موسم سرما کی کسی شام حضرت علامہ کے یہاں حاضر تھے ـــــ بات زندگی اور اس کے امتحانات سے متعلق چل نکلی۔ حضرت علامہ

www.IqbalCyberLibrary.net All rights reserved 2002-2006

نے فرمایا کہ امتحان کے بغیر آدمی کی صلاحیتوں کا ثبات وارتقا ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ امتحان اہلیتوں کو سند عطا کرتا ہے، لہٰذا امتحان اور آزمائش ایک طرح سے اللہ کی رحمت ہے، پھر بقول ڈاکٹر نیاز احمد، حضرت علامہ نے شیطان کا ذکر کیا کہ اگر شیطانی وساوس اور ابلیسی حیلے نہ ہوتے اور اس طرح آدمی کو اپنے عقیدے، ایمان، اصول اور نیک ارادے کو امتحان میں ڈالنے کا موقع نہ ملتا تو اسے کس طرح معلوم ہوتا کہ اس کا ایمان صادق ہے اور وہ واقعی کسی پختہ عقیدے اور اصول کا مالک ہے۔ بغیر شیطان کے آدم کی اہلیت اور اس کے امکانات پروان نہ چڑھتے۔ ڈاکٹر نیاز احمد کا بیان ہے کہ یہ سن کر میں نے عرض کیا :

> حضور والا! اس طرح تو پھر شیطان بھی آدمی کے حق میں، بالواسطہ، اللہ کی رحمت ٹھہرا۔

برجستہ فرمایا :

> "بالکل درست ہے مگر یہ بات مولوی کو نہ بتانا ـــــ"

آخری جملہ جیسا کہ عیاں ہے، حضرت علامہ کی ظرافتِ مزاج کا مظہر ہے ورنہ جس امر پر انھوں نے زور دیا ہے، وہ امتحان و آزمائش کا لازم ہے۔ اور شیطان ایک مسلسل امتحان ہے ـــــ ایک مسلسل دعوتِ مبارزت ـــــ جس کی بدولت آدمی کی ایمانی و اصولی بلندی و پستی واضح ہوتی رہتی ہے۔ آدم کی جملہ اخلاقی اور روحانی فتوحات دراصل ابلیس کی ہزیمت کا اعلان ہیں۔ ابلیس کے بغیر حیاتِ آدم روحانی اعتبار سے بے ولولہ ہوتی، اس لیے کہ اس میں دعوتِ مبارزت اور چیلنج نہ ہوتا، نہ مقابلہ نہ ولولہ۔ بے مقابلہ و ولولہ فتح میں سرشاری کی روح کیونکر پیدا ہوتی ـــــ جبھی تو حضرت علامہ نے فرمایا تھا ـــ

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد[۲۵]

اور یہیں یہ نقطہ بھی بطورِ یقین سامنے آجاتا ہے کہ حضرت علامہ کو اگر وہ جہان قبول نہ تھا جہاں یزداں تو ہو مگر شیطان نہ ہو تو یقیناً وہ جہان بھی قبول نہ تھا جہاں فقط شیطان ہو اور یزداں نہ ہو ـــــ ـــــ واضح ہے کہ ابلیس کے بارے میں حضرت علامہ کا رویّہ اور نقطۂ نظر عام روایتی رویّے اور نقطۂ نظر سے قدرے مختلف ہے۔ پروفیسر تاج محمد خیال لکھتے ہیں :

In *Javid Namah*, he inquires from Sayyid Ali Hamadani about the nature of good and evil and as to why evil was created. Sayyid Hamadani replies that association with Satan leads to man's fall, but struggle with Satan leads to man's perfection. Human personality is a sword that needs a whetstone to be sharpened. This whetstone is Satan and evil, and without them human personality cannot find its full growth and expansion.

بزم با دیو است آدم را وبال
رزم با دیو است آدم را جمال!
خویش را بر اہرمن باید زدن
تو ہمہ تیغ آں ہمہ سنگِ فسن!
تیز تر شو تا فتد ضربِ تو سخت
ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت![۲۶]

جناب بشیر احمد ڈار، ملٹن کے حوالے سے تقریباً وہی بات کہتے ہیں جو ایک طرح سے حضرت علامہ کے پیشِ نظر تھی، یعنی ہبوطِ آدم کے ضمن میں شیطان کا کردار درحقیقت آدم کے لیے پوشیدہ نعمت تھی:

Satan seduced Eve and Adam, and thereby became a means, not of inflicting any punishment on mankind by driving them out of Paradise to this hell of earth, but of untold blessings in the form of giving them an opportunity to exercise freedom of choice by which man has the opportunity to create "a paradise within...happier farre".[۲۷]

وہی بات جو پہلے بیان ہو چکی ہے کہ ؎

مجھے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اور ؎

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

حضرت علامہ شیطان کو "خواجۂ اہلِ فراق" قرار دیتے ہیں۔ یعنی وہ وجود جو بارگاہِ ایزدی سے دُور ہٹا دیے جانے والوں کا سربراہ ہے، سب سے بڑا راندۂ درگاہ —— مگر "خواجۂ اہلِ فراق"

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-200

کہ کے عاشقوں کی نظر میں اُسے کسی قدر قابلِ ہمدردی بنا دیا ـــــ بلکہ کچھ احترام کا بھلاوا پڑتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو، وہ وجود جس نے آدم کی داستان کو رنگ و آہنگ عطا کیا اور جسے ایک مستقل امتحان اور چیلنج کے روپ میں آدم کی ناگزیر ضرورت بنا دیا گیا ہو، اور پھر ناگزیر ضرورت کے پردے میں اسے آدم کے حق میں ایک طرح سے ' عملاً ' رحمت کا ذریعہ بنا دیا گیا ہو، اس کے حق میں کسی قدر ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنا کوئی ایسا ناموزوں عمل بھی نہ تھا۔ ۔ ۔ ابلیس کی زبان سے جبریل کو مخاطب کرا کے بجا ہی تو کہا تھا کہ

قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟

اور تو اور حضرت علامہ، ابلیس کے ہاتھوں اولادِ آدم کے بے بس ہو جانے کی کیفیت پر ابلیس ہی کو نوحہ کناں دکھاتے ہیں، ابلیس بنو آدم کے ناپائدار ایمان اور ڈھیلے عزم پر ماتم کرتا ہے، اس کی خواہش ہے کہ اولادِ آدم اس قدر محکم الایمان ہو جائے کہ دنیا میں ابلیس کی شکست اتمام کو پہنچے اور پھر اس کی یہاں ضرورت ہی نہ رہے تاکہ پھر وہ بحضور خدا ملتجی ہو سکے کہ مولا اب آدم میرے بس کا نہیں، اب میرا وجود یہاں کسی کام کا نہیں، مَیں افرادِ آدم زاد کو گمراہ کرنے کے باب میں مایوس ہو چکا ہوں؛ چنانچہ اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کا جو اجازت نامہ مَیں نے لیا تھا، وہ بیکار ہو کر رہ گیا ہے اور میرے مولا مجھے اب واپس میرے مقام پر لوٹا دے ـــــ یہ مضمون " میری کوریلی " کے مشہور و معروف ناول Sorrows of Satan کا مضمون ہے۔ ابلیس کا دُکھ یہ ہے کہ بڑے سے بڑا باعزم متقی بھی زود گسل ثابت ہوتا ہے، ذرا سی بھی ابلیسی آنچ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ذرا سا لالچ، لذتیت کا ہلکا سا دام، ذرا سا امکانِ جاہ کا جھانسا، اور لو کا ٹا ـــــ وہ گیا، اور ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہ دیکھا، نتیجہ یہ کہ ابلیس کی محنت کا عرصہ پھیلتا جاتا ہے ـــــ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ
مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ۝
وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا[۲۸] وَلَٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى
الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ ـــــ

" اور آپ ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیے جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں مگر وہ ان سے ہٹ کر الگ ہو رہا، پھر شیطان نے اسے پیچھے لگا لیا، چنانچہ وہ گمراہوں میں داخل ہو گیا۔ اگر ہم چاہتے تو ان نشانیوں کے ذریعے اس کو اوپر اٹھا لیتے، لیکن وہ تو زمین کے ساتھ

چپکا ہی رہا اور بدستور اپنی ہوس کا پیچھا کرتا رہا۔"

اس آیۂ کریمہ میں اللہ میاں کا بیان یہ اشارہ کرتا ہے کہ اللہ نے آدم کو اپنی نشانیاں بتادیں، ماننا یا نہ ماننا اُس پر چھوڑ دیا۔ خدا کو اگر خود اپنی مرضی کرنا ہوتی تو اُن نشانیوں کے توسط سے اسے بلندیوں کی جانب اٹھا لیتا ـــــــ دوسری بات یہ ہے کہ جب آدمی نے اللہ کی ہدایت نہ مانی تو شیطان نے تاکا اور اس پر اپنے داؤ آزمانے لگا۔ خدا غالب و قادر ہے جبکہ شیطان غالب و قادر نہیں۔ گویا حضرت علامہ کے سببِ بیان، صورت یہ ہے کہ

خدا اور شیطان، دونوں انسان کو صرف مواقع فراہم کرتے ہیں اور یہ اسی پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ مواقع سے جیسا مناسب سمجھے، فائدہ اٹھائے۔[۲۹]

لیکن اولادِ آدم ایسی ناخود شناس بلکہ خود گریز مخلوق ہے کہ شیطان سٹپٹا اٹھتا ہے اور بقول حضرت علامہ فریاد کرنے لگتا ہے کہ خدایا تجھے میری سابقہ طاعت و عبادت کا واسطہ دیتا ہوں، مجھے اس نوعِ آدم سے بچا، یہ تو بلا مقابلہ میرے سامنے ہتھیار ڈال رہے ہیں، حالانکہ میں چاہتا ہوں کہ یہ مجھے شکست دیں۔

اے خداوند صواب و ناصواب
من شدم از صحبتِ آدم خراب!
ہیچ گہ از حکمِ من سر بر نتافت
چشم از خود بست و خود را در نیافت!
خاکش از ذوقِ 'انا' بیگانہ
از شرابِ کبریا بیگانہ!
صید خود صیاد را گوید بگیر
الاماں از بندۂ فرماں پذیر!
بندۂ صاحب نظر باید مرا
یک حریفِ سخت تر باید مرا!
ابنِ آدم چیست؟ یک مشتِ خس است
مشتِ خس را یک شرار از من بس است!
اندریں عالم اگر جز خس نبود
ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود!

بندہ باید کہ پیچد گردنم
لرزہ اندازد نگاہش در تنم!
اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست! [40]

حضرت علامہ خواہاں رہے کہ ابلیس کو بنو آدم کے ہاتھوں شکست نصیب ہو لہٰذا طعناً ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے کہ اے مولا! میں آدم کے قرب کی وجہ سے برباد ہو رہا ہوں۔ ابلیس تو آدم کو ایک امتحان کی صورت میں درسِ جدّوجہد دیتا اور تلقینِ تکمیلِ ذات کرتا رہا ــــ یہ آدم کا فرض تھا کہ ابلیس کو اپنے ایمان کے زیرِ اثر لاتا اور اسے خدا کا باغی نہ بنے دیتا۔ اپنے ایمان کی بدولت اسے مسلمان بنا دیتا۔

خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

"ابلیس کی اگر کوئی ایک شخصیت ہو تو وہ ایک وقت میں ایک جگہ عمل کرتی ہوئی نظر آئے، لیکن حدیث شریف میں ہے، کہ ہر شخص کے ساتھ اس کا شیطان لگا ہوا ہے۔ اس پر ایک صحابیؓ نے ذرا جرأت سے پوچھا کہ کیا حضورؐ کے ساتھ بھی؟ فرمایا! ہاں، میرے ساتھ بھی۔ مگر میں نے اسے مومن بنا رکھا ہے۔ حضورؐ کا شیطان تو مومن ہو گیا۔ لیکن کفّار کے ساتھ لگا ہوا شیطان کافر ہی رہا۔" [41]

اس مضمون کو حضرت علامہ نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے اور مطلب واضح ہے کہ ابلیس کے تابع ہو کر چلنے کی بجائے ابلیس کو اپنی راہ پر لگا لو ــــ ابلیس کا اثر آدمی کے رگ و ریشہ میں راسخ ہوتا ہے۔ اس کا کاملاً قلع قمع کرنا مشکل کام ہے۔ ہاں، اپنے ایمان کی قوت کے باعث اس کی ابلیسیّت کا مزاج، اور پھر رُخ بدلا جا سکتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ابلیس کی فرمائشوں کو ایمان سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے یہاں تک وہ فردِ مومن کی پاکیزہ فطرت سے متوافق ہو کر رہ جائے اور آدم کے خلاف اس کی جنگ اختتام کو پہنچے ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است!
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!

کور را بینندہ از دیدار کن
بُولہب را حیدرِ کرار کن! [۴۲]

مگر یہ تو جب ہو کہ آدم خود اپنے مقام سے آگاہ ہو، جیسا کہ بارہا قبل ازیں بیان یا اشارہ ہوا کہ آدم کا ہبوط اس کی اپنی ذات سے غفلت میں مضمر ہے۔ یہ قطعہ پہلے درج کیا جا چکا ہے ؎

دلے چوں صحبتِ گل می پذیرد
ہماں دم لذّتِ خوابش بگیرد
شود بیدار چوں "من" آفریند
چو "من" محکومِ تن گردد بمیرد [۴۳]

آدمی شاید اپنی حقیقی شان کو جاننے سے گھبراتا بھی ہے۔ اسے اپنی حقیقی حیثیت کا علم ہو جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اسی حیثیت کی مناسبت سے زندگی بسر کرنا پڑے گی۔ بڑا بن کر جینا بعض ایسے مطالبے کرتا ہے جن کو پورا کرنا بے پناہ بے آرامی سے ہمکنار ہونے کے مترادف ہے۔ آدمی خاک سے پیدا ہوتا ہے اور بقول حضرت علامہ شروع شروع میں اس کے وجود کا مادی خلقی پہلو حاوی بھی رہتا ہے۔ [۴۴] اسی لیے وہ مٹی کے قریب رہنے میں سکھ محسوس کرتا ہے۔ یہ جمادی اور نباتی وجود ہے۔ خاکستان سے دوری بے آرامی کا باعث بنتی ہے۔ حیوان کو حرکت کرنا پڑتی ہے۔ رزق کی تلاش یا بچاؤ کی خاطر اپنی جگہ چھوڑنی پڑتی ہے۔ دوڑ بھاگ ناگزیر ہوتی ہے؛ تاہم حیوانی سطح بھی جبلی سطح ہے یا یوں سمجھیے کہ متحرک مشین کی سطح ہے۔ رابطہ زمین ہی کے ساتھ رہتا ہے۔ زمین ہی میں خوراک ڈھونڈنا اور جیسی صورت میں ملے، اسی صورت میں قبول کرنا ——
حیوان کے لیے حقوق و فرائض کے کوئی مسائل نہیں، گویا حیوانی سطح جمادی و نباتی سطح کے مقابل
بے آرام ہونے کے باوصف انسانی سطح کے مقابل بہت پرسکون ہے۔
کوئی حیوان مرضی کا مالک نہیں۔ اختیار خیر و شر اس کی ذمہ داری نہیں۔ کوئی حیوان ارتکاب گناہ کر ہی نہیں سکتا۔ حیوانی سطح پر رہنے والے انسان نما دوپایوں کے معاشرے میں جب کوئی فرد دوسروں سے بہت بلند واقع ہو تو دو صورتیں جلوہ گر ہوتی ہیں، یا تو معاشرہ اپنے فرد کو فرید یا منفرد پا کر اس کا دشمن ہو جاتا ہے جیسا کہ پیغمبروں اور ہادیوں کے ساتھ ہوتا رہا یا فائق افراد کے بت بنا لیتا ہے اور پوجا کرنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین ہیکل کے بقول،
• وقت کے ساتھ ساتھ جوں جوں معاشروں کا ذہنی اوسط بلند ہوتا جاتا

ہے، توں توں فائق افراد کی استثنائی حیثیت کم ہونے لگتی ہے اور وہ
دیوتا کی سطح سے اُتر کر عام انسانی سطح سے قریب ہونے لگتے ہیں"۔[۴۵]

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکابر کے وہ جوہر جو کبھی کرامات دکھائی دیتے تھے، رفتہ رفتہ محض کمالات رہ جاتے ہیں۔ ان میں کوئی عنصر خارقِ عادت یا غیر معمولی دکھائی نہیں دیتا ـــــ غیر معمولی اعمال کو منظرِ عام پر لانا انسانی دسترس سے باہر نہیں فرق محض اتنا ہے کہ کسی آدمی کے یہاں یہ اہلیت زیادہ ہے، کسی میں کم ـــــ چونکہ فردِ آدم کا کام عموماً حواسِ خمسہ ظاہری ہی سے چل جاتا ہے لہٰذا اسے اس سے آگے بڑھنا از راہِ عادت پسند نہیں جس طرح کہ اب وہ سائنسی اوزاروں اور ہتھیاروں کا عادی ہو گیا اور بہت سے معاملات میں اپنے جوہری قویٰ سے کام لینے کی بجائے آلات کا سہارا لیتا ہے۔ پہلے یہ چکھ کر دواؤں کے اجزائے ترکیبی بتا سکتا تھا، اب تجزیے کے لیے مشین پر اعتماد کرتا ہے۔ پہلے محض دیکھ کر یا لمس سے بخار محسوس کر لیتا تھا، اب تھرمامیٹر کا محتاج ہے۔ پہلے بڑی سے بڑی گنتی خود کر لیتا تھا، اب کمپیوٹر کا محتاج ہے۔ گویا پہلے اپنے ظاہری حواس کا قیدی تھا، اب ساتھ ہی ساتھ سائنسی اوزاروں کا بھی قیدی ہو کر رہ گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہہ لیجیے کہ آدمی اپنے ہی بناتے ہوئے اوزاروں کے لیے خود ایک اوزار کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ یوں دیکھیں تو ماننا پڑتا ہے کہ سائنسی ایجادات نے آدمی کو اپنے مَن سے مزید دور کر دیا ہے، اور وہ اشیاء کے برجستہ فہم کی اہلیت سے مزید محروم ہوتا جا رہا ہے ـــــ پہلے نادر الوقوع کمالات کو کرامات کہہ دیا جاتا تھا، اب سرے سے انکار کر دیا جاتا ہے ـــــ اور انکار کی اساس یہ کہ ہماری سائنس یہ ادراک نہیں بتاتی۔ انکار کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ سائنس کی مشینیں آدمی کی تخلیق ہیں جبکہ آدمی خدا کی تخلیق ہے، آدمی کو اللہ نے کسی ذرّہ قدسی سے بھی نوازا ہے جسے محض روحانی قوت کی روشنی کے وسیلے سے دیکھا یا جانا جا سکتا ہے۔ سائنس ایک ہتھیار ہے جو حواسِ خمسہ ظاہری کا مددگار ہے اور جس پر انحصار کرنے کے باعث خود حواسِ خمسہ ظاہری بھی اپنی جوہری اہلیت اور قابلیت کو کمزور کر لیتے ہیں ـــــ حضرت علامہ فرماتے ہیں:

"ہم اپنے بالمقابل جس حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں، اس سے
ربط و اتصال کا بالواسطہ طریق یہ ہے کہ اس کی آیات کے
مشاہدے میں، جیسا کہ ادراک بالحواس سے ان کا انکشاف ہوتا ہے
غور و فکر سے کام لیں، اور یوں ان پر دسترس حاصل کرنے کی کوشش

کریں۔ لیکن اس کا ایک دوسرا طریق یہ ہوگا کہ حقیقت سے، جیسا کہ اس کا انکشاف ہمارے اندرونِ ذات میں ہوتا ہے، براہِ راست تعلق پیدا کیا جائے۔ لہٰذا قرآن پاک کی فطرت پسندی محض اس امر کا اعتراف ہے کہ انسان فطرت سے وابستہ ہے اور یہ وابستگی چونکہ ایک امکانی ذریعہ ہے قوائے فطرت پر غلبہ حاصل کرنے کا، اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس کا استعمال بے روح تعقّب کی بجائے اس مقصدِ عظیم کے لیے کریں کہ ہمیں اپنی روحانی زندگی میں آزادی کے ساتھ مدارجِ کمال کی طرف بڑھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقتِ مطلقہ کے تمام و کمال بقا کی خاطر ادراک بالحواس کے ساتھ ساتھ اس چیز کے مدرکات کا اضافہ بھی ضروری ہے جسے قرآن پاک نے 'فواد' یا قلب سے تعبیر کیا ہے ــــ 'قلب' کو ایک طرح کا وجدان یا اندرونی بصیرت کہیے جس کی پرورش مولانا روم کے دلکش الفاظ میں نورِ آفتاب سے ہوتی ہے اور جس کی بدولت ہم حقیقتِ مطلقہ کے ان پہلوؤں سے اتصال کر لیتے ہیں جو ادراک بالحواس سے ماوراء ہیں۔"[۴۶]

آدمی محض مادی وجود نہیں، وہ بہت کچھ اور بھی ہے۔ اگر مادی وجود ہی ہوتا تو بھی وہ خود اپنا خالق نہ ہونے کے باعث حواسِ ظاہری کی مدد سے ادراکِ ذات کی منزل تک نہ پہنچتا۔ حقیقت کا عرفان، ذاتِ خداوندی کی معرفت کے بغیر ممکن نہیں۔ خدا کی کائنات کو خدا ہی کے عطا کردہ وجدان کی مدد سے جانا جا سکتا ہے ــــ ورنہ پردہ داری ہی پردہ داری ہے۔" اور یہ سلسلہ لاختم ہے۔ Lincoln Barnot کا بیان ہے۔

"He (man) does not understand the vast veiled universe into which he has been cast for the reason that he does not understand himself. He comprehends but little of his organic process and even loss of his unique capacity to perceive the world about him to reason and to dream. Least of all does he understand is his noblest and most mysterious faculty; the ability to transcend himself and perceive himself in the act of perception".[۴۷]

آدمی کی یہ اہمیت کہ وہ اپنی ذات سے بھی ورا، اور بالا ہو سکتا ہے، اسے اس قابل

بناتی ہے کہ وہ اپنے "ادراک" کے عمل کا ادراک کر سکے۔ وہ خود اپنے عمل کا جائزہ بھی لے سکتا ہے اور تجزیہ بھی کر سکتا ہے۔ یہی نہیں، خود اپنے مدرکات کی بھی چھان پھٹک کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ وہ فقط مادی وجود نہیں ـــــ اس کے خاکی پیکر میں کوئی اور شے بھی ہے جو اوپر سے تشریف لاتی ہے۔ آدمی نہ صرف روح ہے نہ صرف بدن بلکہ روح و بدن دونوں سے برتر کوئی ہستی ہے، اسی لیے کہ وہ کہتا ہے میری روح، میرا بدن، میری جان میری دانش، میری فکر، میرا دماغ، میرا دل، میری دیوانگی، میری حماقت وعلیٰ ہذا ـــــ

ـــــ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ "میں" کون کہتا ہے۔ اگر آدمی فقط روح ہے تو "میری روح" کے کلمات عرض کرنے والا کون ہے، اگر آدمی جسم ہی ہے تو "میرا وجود" پکارنے والا وجود کون ہے؟ یہ "میں" یہ "انا" حقیقت ہے۔ اس کا عرفان باہر کی طرف دیکھنے سے حاصل نہ ہوگا، کچھ ملے گا تو اندر سے، ازاں بعد باہر کے حوالے بھی توضیحی مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں ؎

اگر گوئی کہ "من" وہم و گمان است
نمودش چون نمودِ این و آن است
بگو با من کہ دارائے گماں کیست
یکے در خود نگر آں بے نشاں کیست!

جہاں پیدا و محتاجِ دلیلے
نمی آید بفکرِ جبرئیلے!
خودی پنہاں ز حجّت بے نیاز است
یکے اندیش و دریاب ایں چہ راز است!

بہ خود گم بہرِ تحقیقِ خودی شو!
انا الحق گوے و صدّیقِ خودی شو [۸]

• اگر تو یہ جانتا ہے کہ "میں"، یہ "انا" فقط وہم و گمان ہے اور اس کا ظہور بھی صرف "ایں" اور "آں" کا مصداق ہے تو پھر مجھے یہ بتا کہ یہ صاحبِ گماں کون ہے، یہ گماں کا اظہار کرنے والا کون ہے، یہ بول کون رہا ہے ـــــ تو ذرا خود اپنے اندرون میں جھانک کر دیکھ تاکہ

پتہ چلے کہ وہ جس کا کوئی نشان نہیں، وہ کیا ہے۔"

دنیا ظاہر ہے، اس کے باوصف وہ اپنے اثبات کے لیے دلیل کی محتاج ہے۔ اور وہ دلیل کسی جبریل کو بھی نہیں سوجھ سکتی۔ لیکن خودی (انا، مَیں) پوشیدہ ہو کر بھی دلیل سے بے نیاز ہے۔ ذرا غور تو کر آخر یہ کیا راز ہے ـــــ تحقیقِ خودی (یا حصولِ خودی) کے لیے اپنی ذات میں ڈوب جا۔ اور پھر پورے یقین کے ساتھ انا الحق کا نعرہ لگا ـــــ پورے یقین کے ساتھ اپنے ہونے کی صداقت کا اعلان کر ـــــ یہ تصدیقِ خودی، صدیق بن کے کر ـــــ"

واضح ہو کہ حضرت علامہ کے نزدیک خودی، من یا انا حق ہے اور اس کا عالمِ ظواہر سے تعلق نہیں ـــــ اور لطف یہ ہے کہ من یا انا یا میں کی بات جس طرح ہم نے تشریح کے ساتھ ابھی اوپر بیان کی ہے، اس ضمن میں لارڈ نارتھ بورن کی ایک تحریر جب نظر سے گزری تو یہ جان کر خوشی ہوتی کہ 'من، انا یا مَیں' کی دلیل انہیں بھی ویسی ہی سوجھی۔ ان کے الفاظ میں:

I am not anything that I can observe or feel or think about, since observation, sensation and mentation imply a duality between myself and some object that is not myself. We commonly speak of 'my' body or 'my' soul in the same way as we speak of 'my' feelings or 'my' hand or 'my' dog; I am however certainly nothing that I can be said to possess. We also commonly use phrases like 'I said to myself' or' I am ashamed of myself'. Then who or what is the 'I' that says these things? It is not my body; It is not my soul.....'What am I?'[۴۹]

یہ معاملہ حق یہ ہے کہ لطیف بلکہ گریزپا ہے۔ حضرت علامہ نے ایک اور مقام پر ماہیتِ آدم کو بیان کرنے کی بالفاظِ ذیل کوشش کی ہے ؎

طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے، قادر نہیں ہے جس پہ سخن
زمانہ صبحِ ازل سے رہا ہے محوِ سفر
مگر یہ اس کی تگ و دو سے ہو سکا نہ کہن!
اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انساں، نہ روح ہے نہ بدن![۵۰]

یہ راز کسی دلیل و برہان سے نہیں کھلتا کہ ایک وجود جو روح کو بھی اپنی ملکیت بتائے اور بدن کو بھی، عقل کو بھی، دل کو بھی اور دماغ کو بھی حتیٰ کہ کہے میرا وجدان یہ کہتا ہے، وہ دہی کچھ تو نہیں ہو سکتا جس کا وہ مالک ہے۔ خدا نے انسان کو اتنا بڑا راز بنا دیا کہ عقل اور اس کے دلائل اور ان دلائل کے پیدا کردہ یا ان دلائل کے محتاج فلسفے انسان کی حقیقت کو گرفت میں نہیں لا سکتے۔ یہ اس کی وجدانی اور روحانی اہمیت ہے جو اسے نسبتاً زیادہ قربِ حقیقت بخش سکتی ہے، لیکن یہ وجدان اس حقیقت کے قریب فقط اس وقت پھٹک سکتا ہے جب وہ خدائے خلاق پر کامل یقین رکھتا ہو اور اس کا پختہ اعتقاد ہو کہ وہ نورِ مطلق کے کسی کھربویں کے کھربویں حصے گویا اس کے پرتو کو اپنے اندر لیے ہوتے ہے ـــــ وہی بات ؎

نقطۂ نورے کہ نامِ اُو خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است ؎۵۱

یہ نور اگر آدمی کے حیوانی وجود سے مغلوب ہو جاتے اور اس طرح عالمِ خلق کے مادی بوجھ تلے دب جاتے، اور دبا رہے تو وہ زیادہ سے زیادہ ایک عقل مند اور عالم فاضل دوپایہ بن سکتا ہے اور دوپائے کی حیثیت سے خوش گفتار، خوش خیال اور خوش فکر تو بن سکتا ہے، اعلیٰ پائے کا محقق بھی کہلا سکتا ہے، مگر خود اسے اپنی ذات سے آگاہی میسر نہیں آ سکتی ـــــ اسے اپنی ذات سے آگاہی 'نورِ مطلق' سے آگاہی کی بدولت ہی میسر آ سکتی ہے۔ بجا ہی تو فرمایا حضرتِ علامہ نے ؎

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ ؎۵۲

مراد یہ ہے کہ آدمی کا من یا خودی یا ذات استحکام پذیر نہیں ہوتی جب تک وہ خدائے واحد پر ایمان نہ لاتے اور دیگر ہر شے کی محبت یا خوف کے غلبے سے نجات نہ پالے، اس لیے کہ اگر آدمی صرف مادّہ نہیں، صرف روح بھی نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ کوئی ایسی شے ہے جو جملہ کائنات سے بالاتر ہے ـــــ فقط خدا سے فروتر ہے ـــــ اور ظاہر ہے کہ اسے کوئی ایسی ہی شے ہونا بھی چاہیے تھا ورنہ وہ شے اس آیۂ کریمہ کا مخاطب کیونکر بن سکتی تھی:

• ولقد سخّرنا لکم ما فی السّمٰوات وما فی الارض جمیعاً ـــــ •

(ہم نے زمین اور آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے سب تمہارے لیے مسخّر کر دیا ہے) ـــــ

بہرحال، حضرت علامہ عجیب سرمستی کے عالم میں فرماتے ہیں ؎

ہر ایک منتظر تیری یلغار کا
تیری شوخی، تکرد کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت
حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ
حقیقت ہے آئینہ، گفتار زنگ
فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس!
اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم [۵۳]

اگرچہ بیان طویل تھا مگر معنی کے باب میں حسرتِ توضیح وہیں کی وہیں رہی، حضرت عرفی شیرازی نے بجا ہی تو فرمایا تھا ؎

زباں ز نکتہ فرو ماند و رازِ من باقیست
بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست!

حواشی

۱ - قرآن حکیم سورہ ۲۳ ، آیت ۲۷، ۳۷ -

۲ تفسیر ماجدی حاشیہ آیت ۲۷ ، ۳۷ ، سورہ ۲۳ -

۳ - مفرداتِ معجم القرآن ، بیروت ، ص ۲۱ ، ۲۲ -

۴ - حجۃ اللہ البالغہ ، ترجمہ مولوی عبدالحق حقانی ، قرآن محل کراچی ، ص ۴۵ ، ۴۶ -

۵ - ایضاً ص ، ۴۰ -

۶ - حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ ، ص ۱۱۰ -

۷ - تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (دوسرا ایڈیشن) ص ۱۲۸ ، ۱۲۹ -

۸ - حقائقِ اسلام ص ۱۳۱ -

۹ - ایضاً ص ۱۳۱ -

۱۰ - رُوحِ اقبال ، آئینہ ادب لاہور ، ص ۲۱۳ ، (طبع دوم) ۱۹۶۹ء -

۱۱ - تشکیل جدید ، طبع دوم) ص ۲۳۸ -

۱۲ - قرآن حکیم سورہ ۲ ، آیت ۳۵ -

۱۳ - قرآن حکیم سورہ ۷ ، آیت ۲۰ -

۱۴ - تشکیلِ جدید (دوسرا ایڈیشن) ص ۱۳۰ -

۱۵ - تشکیلِ جدید ، ص ۱۲۷ ، ۱۲۸ -

۱۶ - (بالِ جبریل) کلیاتِ اقبال اُردو ، ص ۱۰/۳۰۲

۱۷ - قرآن حکیم سورہ ۷ ، آیت ۲۳ -

۱۸ - بالِ جبریل (کلیاتِ اقبال اردو) ص ۱۳۱/۴۲۳ -

۱۹۔ بال جبریل، کلیات اقبال (اردو) ص ۱۳۲، ۱۳۳/ ۴۲۴، ۴۲۵۔

۲۰۔ فکر اقبال، طبع پنجم، بزم اقبال لاہور، ص ۵۰۷، ۵۰۸۔

۲۱۔ حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ، ص ۱۰۹۔

۲۲۔ Shaheer Niazi, *Adam in Paradise on Earth*, S-2/8, Saudabad Karachi-27, P.26.

۲۳۔ کلیاتِ اقبال اردو (بال جبریل) ص ۱۵/ ۳۰۷۔

۲۴۔ ایضاً ص ۸/ ۳۰۰۔

۲۵۔ ایضاً ص ۶/ ۲۹۸۔

۲۶۔ ایضاً ص ۵۰/ ۳۴۲۔

۲۷۔ ایضاً ص ۴۴/ ۳۳۶۔

۲۸۔ ضربِ کلیم/ کلیاتِ اقبال (اُردو) ص ۵۷/ ۵۱۹۔

۲۹۔ کلیاتِ اقبال فارسی، زبورِ عجم ص ۱۰۹/ ۵۰۱۔

۳۰۔ ایضاً ص ۱۸۷/ ۵۷۹۔

۳۱۔ ایضاً ص ۶۴/ ۴۵۶۔

۳۲۔ ایضاً ص ۱۳۵/ ۵۲۷۔

۳۳۔ بالِ جبریل/ کلیاتِ اقبال (اردو) ص ۶/ ۲۹۸۔

۳۴۔ ارمغانِ حجاز/ کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۶/ ۸۸۸۔

۳۵۔ پیامِ مشرق/ کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۱۳۲/ ۳۰۲۔

۳۶۔ M.Saeed Sheikh, *Studies in Iqbal's Thought and Art*, بزمِ اقبال، کلب روڈ، لاہور ص ۲۷۹ (اشعار فارسی کلیات فارسی جاوید نامہ ص ۱۴۰/ کلیاتِ فارسی ۷۴۸)

۳۷۔ ایضاً ص ۳۰۱۔

۳۸۔ قرآن حکیم سورہ ۷، آیت ۱۷۵۔

۳۹۔ شذرات فکر اقبال، ترجمہ از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص ۱۵۲۔

۴۰۔ جاوید نامہ/ کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۱۳۷، ۱۳۸/ ۷۲۵، ۷۲۶۔

۴۱۔ فکرِ اقبال، طبع پنجم جون ۱۹۸۳، بزمِ اقبال، لاہور۔

www.IqbalCyberLibrary.net All rights reserved.

۴۲۔ جاوید نامہ/ کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص ۷۵/ ۶۶۳۔

۴۳۔ ارمغانِ حجاز / کلیاتِ فارسی ، ص ۱۲۲/ ۱۰۰۴۔

۴۴۔ *Reconstruction of Religious Thought in Islam*, 1944, P.106.

۴۵۔ الایمان والمعرفۃ والفلسفۃ ، دارالمعارف القاہرہ ، ص ۱۳۶ ، ۱۳۷۔

۴۶۔ تشکیلِ جدید ، ص ۲۲ ، ۲۳۔

۴۷۔ *The Universe and Dr. Einstein*, Mento book (1954), P.127.

۴۸۔ زبورِ عجم / کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۱۷۰، ۱۷۱/ ۵۴۲، ۵۴۳۔

۴۹۔ Lord Northbourne, *Religion in the Modern World*, Lahore, Suhail Academy, 1981, P.76-79.

۵۰۔ ضربِ کلیم/ کلیاتِ اقبال (اردو) ص ۵۷/ ۵۱۹۔

۵۱۔ اسرار و رموز/ کلیاتِ فارسی ص ۱۸/ ۱۸۔

۵۲۔ ضربِ کلیم/ کلیاتِ اردو ، ص ۱۵/ ۴۷۷۔

۵۳۔ بالِ جبریل/ کلیاتِ اقبال اردو ص ۱۲۸، ۱۲۹/ ۴۲۰، ۴۲۱۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

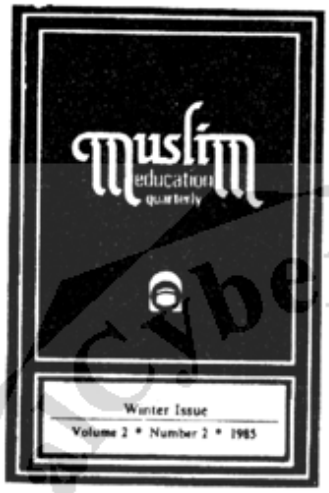

146

MUSLIM EDUCATION QUARTERLY is a review of Muslim education in the Modern World both in Muslim majority and in Muslim minority countries.

It is intended as a means of communication for scholars dedicated to the task of making education Islamic in character:

(1) by substituting Islamic concepts for secularist concepts of knowledge at present prevalent in all branches of knowledge,

(2) by getting curricula and text books revised or rewritten accordingly and

(3) by proposing concrete strategies for revising teacher-education including teaching methodology.

It is also expected to act as an open forum for exchange of ideas between such thinkers and others including non-Muslims who hold contrary views.

MUSLIM EDUCATION QUARTERLY

Published quarterly in Autumn, Winter, Spring and Summer

Editor: Professor Syed Ali Ashraf

- Contains articles on Islamic education, morality, art, culture, etc.
- Critically evaluates educational issues from the Islamic point of view.
- Contains 'Reminiscences' of contemporary Muslim educationalists.
- Publishes surveys of Muslim education in all countries of the world.
- Publishes book reviews.

SEND YOUR SUBSCRIPTION NOW

To: The Secretary, The Islamic Academy

Please enter my subscription for MUSLIM EDUCATION QUARTERLY

I enclose a cheque/P.O. for .... (make cheque payable to The Islamic Academy. The cheque should be in sterling pounds).

Name ....

Address ....

....

Subscription Rates (including postage): Please indicate your preference.

Private Subscribers	☐	£10.50 per annum
	☐	£ 2.65 per issue
Institutions	☐	£13.00 per annum
	☐	£ 3.50 per issue

THE ISLAMIC ACADEMY

23 Metcalfe Road, Cambridge, CB4 2DB U.K. Tel. (0223) 350976

CyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006